Dr

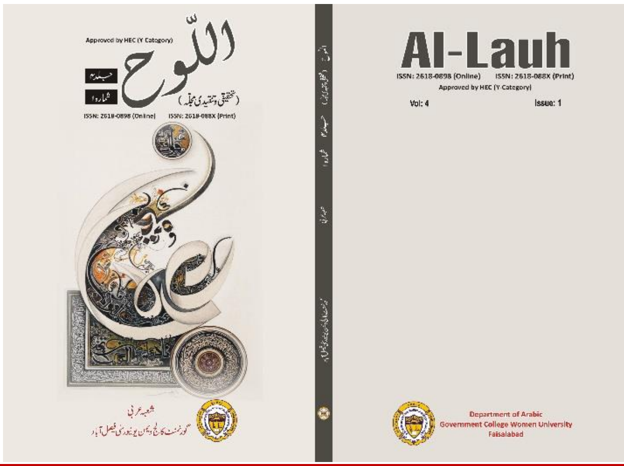

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

Al-Lauh

Bi-Annual, Trilingual (Arabic, English, Urdu) ISSN: (P) 2618-088X. (E) 2618-0898

Project of **Govt. College Women University Faisalabad,**

Madina Town, Faisalabad, Pakistan.

Website: www.allauh.com

Approved by Higher Education Commission Pakistan

Indexing: Euro Pub, Journal Factor, DOAJ, DRJI, Urdu Jaraid, Asian Research Index

TOPIC

اسلامی اخلاقیات کی معاصر صورتیں : تحقیقی جائزہ

Contemporary Islamic Ethics Image: Achievement Award

AUTHOR

1. Dr Qaria Nasreen Akhtar, Assistant Professor, Institute of Islamic Studies, Baha Uddin Zikriya University, Multan

How to Cite: https://allauh.pk/

https://allauh.pk/index.php/allauh/issue/view/4

Vol. 4, No.1 || January to June 2025 ||

Published online: 30-06-2025

اسلامی اخلاقیات کی معاصر صورتیں : تحقیقی جائزہ

Contemporary Islamic Ethics Image: Achievement Award

ڈاکٹر قاریہ نسرین اختر[1]

Abstract:
Quran is the greatest book of the world. Who paid the most attention to the social aspect of human life and explained in the best way what kind of morals are required in the life of a nation and an individual. What are the principles of ethics and what should be their reference and source? This entire book discusses the philosophy of ethics. There is no doubt that all the religions of the world are based on morals and the purpose of Muhammad's mission was also the fulfillment of high morals. The importance of individual and collective ethics in human life cannot be denied. Every nation, every religion, and every era has emphasized morality. Be it spiritual development or material development, any kind of development is not possible without high morals. One of the foundations on which the edifice of progress is built is ethics. Other elements of development and ethics involve action and reaction. Ethics drives the rest of the elements and these elements drive ethics and thus a nation on the road to progress. In view of the importance of ethics, ethical issues were discussed in every era. Ever since man came into the realm of civilization, every nation and country has formulated moral laws. In this paper, the contemporary forms of Islamic ethics have been researched. Which shows that the morality of man which the Holy Qur'an discusses is an important branch of regular knowledge and philosophy. This knowledge does not force a person to be virtuous, but it makes the usefulness of virtue clear to him. This knowledge teaches a person to distinguish between good and bad. Now man has the task of willpower to act according to morals or not.

Key Words: Ethics, Laws, Willpower, Contemporary Situations

اسلام میں اخلاقیات کی تعلیم دینے کے لیے بہت سے طریقے اور اسلوب کو اختیار کیا گیاہے۔ مثلاً قرآن مجید میں حسن اخلاق کوعمدہ تشبیوں اور رذائل اخلاق کو بدصورت اور نفرت انگیز صورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اچھے اخلاق کے اچھے اور برے اخلاق کے برے ثمرات کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز اخلاق کے اوصاف کو الوہیت، بادشاہت اور رسالت کے فضائل میں اور رذائل کو شیطان کی صفات میں شمار کیا ہے۔ان ضرورتوں کو خوش اسلوبی سے محسوس کیا جاتا ہے جو اعمال اخلاق کا محرک ہیں۔ فرد اور قوم کی فلاح کے لیے اخلاق اور قانون دونوں کی ضرورت ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے تکمیلی ہیں۔ تعلیمات اسلام میں یہ دونوں پہلو موجود ہیں اور ان کا فرق بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک طرف واعظانہ اور حکیمانہ انداز میں اخلاقی اصلاح اور حقوق کے احترام پر زور دیاجاتا ہے اور دوسری طرف ان برائیوں کا مقابلہ کرنے پر جو دوسرے کے حقوق پر براہ راست اثر ڈالتی ہیں۔ جیسے چوری، ڈاکہ ، قتل اور حملہ وغیرہ انہیں براہ راست قانون کے تحت رکھا ہے اور ان کےلیے معین سزائیں مقرر کی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں

عمومی ضابطہ اخلاقی کے طور پر برائی کے زمروں میں رکھ کر برائی سے بیزاری و کراہت کا روحانی کیفیت پیدا کی جائے ۔ وہ اس لیے کہ صرف سیاست اور تقریری ضابطے سے اخلاقی ذمہ داریوں کو پیدا نہیں کیاجاسکتا اور نہ ہی مجرموں کےد لوں میں مجرمانہ کیفیات کا ازالہ کیاجاسکتا ہے۔ یہ اس قانون کی ایک خصوصیت ہے۔ جسے اخلاق کا قانون کہاجاتا ہے جو قلب وخیالات پر حکومت کرتا ہے۔ اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی اخلاقی ترقی تمام امور کی ذات کے گرد گھومتی ہے اور ان کی کوششوں سے یہ خوشبو آتی ہے کہ آج دنیا میں ہر طرف اخلاقیات کا رنگ و روغن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب کے اختلافات کے باجوود اخلاقی احکام کے لحاظ سے ان سب میں ایک نسبتی اتحاد ہے اور وہ ایک ہی معدن کے جوہر اور ایک ہی سمندر کی موجیں ہیں۔

اخلاق معنی و مفہوم

لفظ اخلاق عربی زبان سے ماخوذ ہے۔ خلق کی جمع اخلاق جس سے مراد اچھی عادات و تہذیب، انسانیت ملنساری، مروت و آؤ بھگت وغیرہ۔ایسا علم جس میں نفس تہذیب اور معاشِ دھار وغیرہ بحث کی جاتی ہے۔[1] اخلاق کا لفظی مطلب پختہ عادات۔وہ پختہ اوصاف جو کسی کی فطرت اور طبیعت کا اس طرح لازمی جز جائیں کہ زیادہ غورفکرکے بغیر روز مرہ کی زندگی میں ظہور ہوتا ہے۔ [2]انگریزی زبان میں اخلاقیات کو ایتھکس(Ethics)لکھاجاتا ہے۔ یہ لفظ ایتھور سے مشتق ہے۔ جس کے معانی ہیں۔ قواعدورسوم اور خصوصاً وہ وقواعد ورسوم جو ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کرتی ہے۔اسی طرح سے لاطینی لفظ مارل(Moral) جو مارس(Mors)سے مشتق ہے۔ اس کا مطلب بھی رسوم ورواج۔[3] پروفیسر للی کا خیال ہے کہ اخلاق انسان کے کردار کومعیار ی سائنس اور کردار کے مطالعہ سے خیروشر باثواب و خطا کی حیثیت سے بحث کرتی ہے۔ [4] شاہ ولی اللہ کے مطابق’’خلق انسان کی اس حالت کا نام ہے جو اپنی فطرت کے مختلف صفات کو اپنی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے‘‘۔[5] خلق کی عمدہ تعریف میں امام غزالیؒ لکھتےہیں: ’’خلق روح کی اس بنیاد کا نام ہے جس سے تمام اعمال بغیر کسی دقت کے انجام پاتےہیں، اگر یہ اعمال عقلی اور شرعی لحاظ سے اچھے اور تعریف کے قابل ہوں تو یہ حسن کردار کہلاتا ہے اور اگر برا اور قابل ملامت ہو تو یہ برا کردار کہلاتا ہے‘‘۔[6]ان تمام تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ضرورت نے انسان کی طبیعت میں دوسرے انسانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کی خواہش پیدا کی ہے کہ نہ خود کو نقصان پہنچے نہ دوسروں

1. مولوی نوارلحسن، نیرکاکوردی، نوارللغات، جنرل پبلشنگ ہاؤس کراچی،ج۱،ص۲۹۳
2. قادری، سید حسین ، ڈاکٹر ، امام غزالیؒ کا فلسفہ مذہب واخلاق، کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۶۱ء، ص۳۳۳
3. سی اے قادر، پروفیسر، اخلاقیات،اردو اکیڈمی لاہور پاکستان، ۱۹۸۴ء،ص۱۰
4. سی اے قادر، پروفیسر، اخلاقیات،ص۳
5. شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، (مترجم عبدالحق حقانی)، فرید بک سٹال لاہور،ص۲۵۴
6. امام غزالیؒ ، احیائے علوم الدین، دارالاشاعت کراچی، ج۳،ص۳۹

کو نقصان کا خدشہ ہو۔ زیادہ صاف الفاظ میں خود بھی راحت ہو اور دوسرے کو بھی راحت، اس خواہش کا اخلاق ہے۔

علم الاخلاق کا موضوع

ہرانسان کی طبیعت میں اخلاقی مادہ موجود ہوتا ہے اور اسی بنا پر انسان سے اعمال کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن صرف طبیعت میں محرکات اخلاق (Ethical Motives)موجود ہونے سے انسان خوش اخلاق نہیں ہوجاتا۔ جب تک وہ اخلاق کے اصول نہ ہوتے اور وہ غلطیاں جو کسی طاقت کے اندھا دھند استعمال سے پیدا ہوجاتی ہیں۔ ان سے دور نہ رہے۔ لہٰذا علم الاخلاق ایسا ضابطہ قانون ہے جس پر عمل کرنے سے ایک شخص انسان کامل(Perfect Man) بن جاتا ہے۔ جس قدر جو شخص ضابطہ اخلاق کا زیادہ پابند ہوگا اسی قدر وہ باکمال ہوگا۔ درست ونادرست افعال میں اعتبار، افعال وکردار کی رہبری کے لئے معین اصول وقوانین، ان قواعد وضوابط میں دقت نظر کے ساتھ غوروخوض اور اس قسم کے سوچ وبچار کے مجموعہ کا نام علم الاخلاق ہے۔[1]

پروفیسر للی کی تعریف کے مطابق اخلاقیات انسانی کردار کی معیاری سائنس ہے۔ ہر سائنس کسی خاص موضوع سے بحث کرتی ہے اور اس موضوع کے متعلق منظم مرتب اور مدون علم پیش کرتی ہے۔ مثال کے طور پر حیاتیات کولو، حیوانات کیا ور نباتات کے متعلق ہر کس وناکس کچھ نہ کچھ علم ضرور رکھتا ہے۔ لیکن عام آدمی کا علم غیر منظم وغیرہ مرتب معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے ایک جزو کا دوسرے جزو کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ماہر حیاتیات کوآلودہ منتشر اور پراگندہ واقعات کو منظم کرکے کلیات(Principles)وضع کرتا ہے اور سیاق وسباق میں ربط پیدا کرتاہے۔ بعینہ یہی کیفیت علم الاخلاق کی ہے۔ نیکی اور بدی کو ہر شخص سمجھتا ہے۔ لیکن اکثر اشخاص کا علم غیر مربوط اور غیر مسلسل کلیات پر مشتمل ہوتا ہے۔ علم الاخلاق کا کام یہ ہے کہ ان معلومات کو اکٹھا کرکے ایک سلسلے میں منسلک کرے۔ ان سے اصول وضع کرے اور معیار اخلاق کا پتا لگائے۔ [2]

اخلاقیات کا علم لوگوں کے اچھے یا برے اعمال پر بحث کرتا ہے۔ لیکن ہر عمل کو اچھا یا بر انہیں جاسکتا۔ مثال کے طور پر کچھ افعال غیر ارادے کے طور پر برآمد ہوجاتےہیں۔ مثلاً سانس لینا، دل کا دھڑکنا،اچانک روشنی کے سامنے آنے سے پلک کا جھپکنا جیسے اعمال کا اخلاقیات کے علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم انہیں اچھا یا برا ہونے کا حکم نہیں دیتے ۔ اور ان لوگوں کو بھی نہیں جن سے یہ کام ہوجاتےہیں۔ وہ نیک یا بدکار کہتےہیں اور انہیں ان کے اعمال کا جوابدہ نہیں ٹھہراتے ہیں۔ کچھ اعمال ایسے ہوتےہیں جو انسان اپنی نیت سے کرتا ہے۔

علم الاخلاق لوگوں کے اعمال سے اس طور پر بحث کرتا ہے کہ ان پر اچھے یا برے ہونے کاحکم لگائے لیکن ہر عمل پر اچھے اور برے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ مثال کے طور پر بہت سے افعال غیرارادی طور پر صادر ہوجاتے ہیں۔ مثلاً

1. سید حسین قادری، امام غزالی کا فلسفہ مذہب واخلاق،ص۳۳۴
2. سی اے قادر، پروفیسر، اخلاقیات،ص۴

سانس لینا، دل کا حرکت کرنا۔ روشنی میں اچانک آجانے سے پلک جھپکنا توان امور کا علم الاخلاق کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم نہ ان پر اچھے یا برے ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ نہ ان لوگوں کو جن سے کہ یہ امور صادر ہوئے۔ نیکوکار یا بدکار کہتے ہیں اور نہ ان اعمال کی وجہ سے ان کا محاسبہ کرتے ہیں۔کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں انسان اپنے ارادے سے کرتا ہے۔

ان کے نتائج پر غور کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بندہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے شہر میں ہسپتال بنانے سے قوم کو فائدہ ہوگا اور ان کی مصبیتوں میں کمی آئے گی۔ اسی سوچ کے ساتھ وہ ہستپال بنادیتا ہے یا اس کے برعکس ایک بندہ اپنے اپنے مخالف کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اپنے ارادے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور یہ اعمال ارادی کہلاتے ہیں اور انہیں اچھے یا برے ہونے کا حکم دیا جاتا ہے اور جو ان کا ارتکاب کرتا ہے اسے سزا ملتی ہے اور وہ ان معاملات کا جواب دہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اعمال کی ایک قسم اور بھی ہے ۔ یعنی ایک آدمی نیند کی حالت میں بھی بعض کام کرگزرتا ہے۔ ایک شخص اٹھتا ہے نیند ہی کی حالت نہیں گھر کو آگ لگادیتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا نیند ہی کی حالت میں اٹھ کر گھر کو جلاڈالنے والی آگ بجھا دیتا ہے تو کیا ان اخلاقی عادات کے طور پر پہلے والے کی ملامت کی جائے اور دوسرے کو قابل تعریف سمجھا جائے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو نسیان (بھول) کی بیماری لگ جاتی ہے اوراس بیماری کی وجہ سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرسکتا۔ جس کا وقت مقررہ پر کرنا اس کے لئے ضروری تھا۔کبھی انسان کسی کام میں اس قدر منہمک او رمتفرق ہوتا ہے۔ مثلاً کسی دلچسپ ناول یا کہانی کے پڑھنے میں کہ وہ اپنے کیے ہوئے وعدے یا وقت مقررہ کے درس سے غافل ہوجاتا ہے۔ذرا غور وفکر کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام افعال غیرارادی ہیں۔ کیونکہ پہلی صورت میں یہ نہیں کہاجاسکتا کہ سوئے ہوئے بندے نے جان بوجھ کر آگ لگائی اور اس کا نتیجہ اس نے پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے اس کاروائی کا محاسبہ نہیں کیاجاسکتا کیونکہ اس حالت میں یہ غیرارادی طور پر سامنے آیا ہے۔ ہاں اگر اس شخص کو معلوم ہو کہ وہ اس مرض کا شکار ہے۔ اور اس سے نیند میں ایسے اہم حادثات صادر ہوتے رہتے ہیں اور پھر وہ بیداری میں ان امور سے احتیاط نہیں کرنا جوان حادثات کا سبب بنتے ہیں۔ یعنی آگ اور اس کے لوازمات کو اپنی خواب گاہ سے جدا نہیں رکھتا تو ضرور ان اعمال میں بھی اس سے محاسبہ ہوگا۔

فرض کرو تم سورہے ہو اورچولہے میں تم نے آگ روشن چھوڑ دی۔ ایک چنگاری اڑی اور اس کے گھر کو جلادیا۔ ایسے میں تمہارا یہ اعتراض نہیں مانا جائے گا کہ اس میں میرا قصور نہیں کہ میں نیند کی کیفیت میں کیسے اڑنے والی چنگاریوں کو روکوں۔ اس کےجواب میں تمہیں یہی بتایا جائے گا کہ تمہیں معلوم تھا کہ تم عنقریب سونے والے ہو تو پہلے ان ذرائع سے کام لینا چاہیے تھا جن کی وجہ سے سوتے وقت یہ حادثہ ہوا یعنی آگ بجھا کر سوجاتے۔اسی طرح ایک شخص بھوک سے پریشان ہو اور اسی بھوک کی وجہ سے وہ چوری و قتل کرنے پر مجبورہوجاتا ہے تو وہ اپنے اس عمل کا جوابدہ ہے۔ کیونکہ وہ کھوئی ہوئی عقل وشعورنہیں۔ جس فعل کا وہ ارتکاب کررہا ہے۔ اس کی حقیقت سے بخوبی واقف ہے۔

گویا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخلاقیات کے موضوع میں دو طرح کے اعمال پائے جاتےہیں۔

۱۔ ایسے اعمال جو عمل کرتے وقت اگرچہ بغیر ارادہ صادرہوتے ہیں۔ لیکن اختیار، شعور اور ارادہ کے وقت ان سے احتیاط کرسکتا ہے۔
۲۔ ایسے اعمال جو عمل کرنے والے کی مرضی سے جاری ہوتے ہیں اور عمل کے وقت وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے۔

وہ یہ وہ اعمال ہیں جن پر خیروشر کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن وہ اعمال جو نہ نیت سے کیے جاتےہیں نہ ہوش وھواس سے اور نہ ان میں احتیاط برتی جاسکتی ہے۔ وہ اخلاقیات کا موضوع نہیں بن سکتے۔ [1]

علم الاخلاق کا فائدہ

ہر علم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان امور پر بحث ہوتی ہے جو اس کے بارے میں شوق رکھتےہیں۔ ایک تنقیدی نظر دیتا ہے۔ لہٰذا اخلاقیات کے علم کو بھی یہ شان حاصل ہےکہ جو شخص اس کا شوق رکھتاہے۔ یہ اسے اعمال کی صحیح اور غلط نوعیت کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت فراہم کرتا ہے اور اسے ان کے صحیح اور پائیدار تقویم سے اس طرح آگاہ کرتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں فیصلہ کرنے میں لوگوں کے رجحانات اور تقلیدی سے متاثر نہیں ہوتا۔اس کی تائید نظریات، اصولوں اور مفروضوں سے ہوتی ہے۔ [2]یہ بات بھی قابل غور ہے کہ علم الاخلاق کا دائرہ صرف نظریات اور قواعد کےعلم تک محدود نہیں ہے۔ اس کے مقاصد میں ہمارے ارادوں کو متاثر کرنا اورہدایت کرنا بھی شامل ہے۔ کیونکہ یہی تاثیر ارادوں کو خیر کے اعمال پر آمادہ کرتی اور بہادر بناتی ہے۔ اگر ہم میں یہ جذبہ پیدا ہوجائے کہ اپنی حیات کی تشکیل کریں۔ اپنے اعمال کو پاک اور عمدہ بنائیں اور حیات انسانی کے لئے ایک اعلیٰ مثال قائم کردیں۔ یعنی اپنے اندر حسن عمل۔ حسن کمال اور اخوت جیسے فضائل پیدا کریں۔ مگر تاثیر کو ہر موقع پر کامیابی نہیں ہوتی بلکہ وہی تاثیر بیک وقت اپنا اثر رکھتی ہے۔ جبکہ انسانی فطرت اس کی پیروی کرنے اور اس سے متاثر ہونے کو ہمیشہ تیار رہتی ہے۔[3]

علم اخلاق میں یہ استطاعت اور قدرت نہیں کہ تمام بندوں کو پرہیزگارو نیکوکار بنائے بلکہ علم الاخلاق کا اصل وظیفہ یہی ہے کہ وہ بندوں پر خیروشر اور نیکی و بدی کوواضح کردیتا ہے اور اس طرح نیک اور سچی راہ کو ہموار کردیتاہے۔ اس کاکام زبردستی صالح بنادینا نہیں بلکہ افراد کو صلاحیت کی راہ دکھانا ہے۔جس کا انحصار افراد کے ارادوں پر ہوتاہے کہ وہ اس راہ پر چلے یا نہ چلے۔ اس علم کی مثال ایک طبیب کی سی ہے۔طبیب کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو اچھے یا برے میں امتیاز کرادیتا ہے۔ یعنی جسم وعقل پر اس کے کھانے پینے سے جو اثرہوتا ہے اس کو بیان کردے۔ جس سے مریض کو اختیار ہے کہ اپنی بہتر صحت کیلئے اس سے پرہیز کرے یا طبیب کی ہدایت کو فراموش کرکے اس میں مبتلاء ہوجائے۔علم الاخلاق کی

1۔ سیوہاروی،مولانا محمد حفظ الرحمن ، اخلاق اور فلسفہ اخلاق،ص۳
2۔ خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، شعبہ تصانیف جامعہ کراچی، ص۲۸۶
3۔ سیوہاروی،مولانا محمد حفظ الرحمن ، اخلاق اور فلسفہ اخلاق،ص۸

بھی یہی حالت ہے کہ وہ ان کی چشم عبرت و بصیرت کو کھول دیتا ہے تاکہ انسان خیروشر اور اس کے آثار ولوازم کو جان لے۔ سو علم الاخلاق کا فائدہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ ہم میں ایسے ارادوں کی مضبوط قوت موجود نہ ہو جو ہم کو اخلاقیات کے امور کو اختیار کرنےاور اس کے نواہی (عنوانات) سے پرہیز کرنے کےلیے آمادہ کرسکے۔ [1]

یہ علم اپنے جاننے والوں میں کھرے کھوٹے کا امتیاز پیدا کردیتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ اپنے آپکو نیکی کی بلندیوں پر فائز کرسکتے ہیں اور برائی کی پستیوں میں گرانے سے بچا سکتے ہیں۔ جس طرح علم طب انسانی جسم کی تندرستی اور بیماری سے بحث کرتاہے اور اپنے جاننے والوں کو جسمانی عوارض سے بچنے اور صحت کے اعلیٰ اصولوں پر عمل کرنے ہدایت کرتا ہے اس طرح علم الاخلاق ہمیں نفسانی بیماریوں سے بچنے۔ اچھے برے میں تمیز کرنے اپنے اردے اور نیت کو دوست کرنے کی تلقین کرتاہے۔ یہ علم انسان میں براہ راست اچھائی اور برائی میں امتیاز کرنے کی قوت پید اکرتاہے۔ وراثت، ماحول یا غلط صحبت سے جو غلط خیالات اور بیماررجحانات انسان کو مل سکتے ہیں۔ یہ علم ان پر تبصرہ کرکے صحت مند اور مفید رجحانات کو اپنانے اور غلط خیالات کو دور کرنے کی طاقت بخشتا ہے۔[2]

اخلاق کے بنیادی مسائل کی تقسیم

یوں تو اخلاق کی جزئیات بہت ہیں جو بہت تفصیل کی محتاج ہیں۔ مگر غوروفکر اور وسعت نظر کے بعد ان تمام جزئیات کو جدا جدا چنداصول پر منحصر کیا جاسکتا ہے گویا اخلاق کے بنیادی مسائل کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔

۱۔ ہر کام افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال سے ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایک بہتر سے بہتر کام اگر اپنی حد سے متجاوز ہوں یا بے محل اور بے موقع کیا جائے تو وہ اخلاق نہیں۔ بلکہ بداخلاقی بن جاتی ہے اور جو کام حدد کے اندر برمحل اور صحیح حیثیت سے کیا جائے وہ اخلاق میں داخل ہے۔ غرض انسان اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو اعتدال کے ساتھ کام میں لائے اور کیونکہ زندگی کی فلاح ومسرت کے لئے توسط و اعتدال اور میانہ روی ضروری ہے۔

۲۔ اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ترقی پذیر نہیں ہوسکتا جب تک کہ افراد وقوم وملت میں دوسرؤں کے لئے ایثار قربانی اور ان میں سے ہر شخص کے مناسب احترام و حقوق شناسی کا جذب موجود نہ ہو دوسروں کے نقصان سے بے پروا ہو کر صرف اپنی ذات اپنے بال بچوں، اپنے حلقہ کے مخصوص لوگوں کے لئے راحت ولذت کا سامان جس میں دوسروں کو اذیت سے بے پروائی ہو وہ خود غرضی ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: [لایومن احدکم حتی یحب الدخیہ وقال لجارہ مایحب نفسیہ] [3]’’تم اس وقت مومن کہلانے کے مستحق نہیں ہو جو تب یہ صفت پیدا نہ کرلو کہ اپنے بھائی یا اپنے پڑوسی کے لئے وہی محبوب نہ سمجھو جو اپنی ذات کے لئے محبوب سمجھتے ہو‘‘۔ ایمان خودغرضی سے روکتا ہے اور

1۔ سیوہاروی،مولانا محمد حفظ الرحمن ، اخلاق اور فلسفہ اخلاق،ص۶۔۷

2۔ جے ایف اسٹوٹ مترجم مولوی مرزا محمد ہادی، علم النفس،ص۵

3۔ القشیری،مسلم بن حجاج ،صحیح مسلم، حدیث ۱۷۲

ایثار اپنی حقیقت میں حسن خلق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾[1]''وہ اپنے نفس پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں''۔

۳۔ انفاق یعنی اداء حقوق مالی بھی اخلاق کی بنیاد ہے۔ عدل اور احسان اپنی اہمیت کے باوجود بے رونق اور جلاونور سے محروم ہیں۔ جب تک اکتنارواحتکار کے جذبہ سے بالاتر ہوکر انفاق یعنی ادائے حقوق مالی میں پیش قدمی نہ ہو اور اس کے بے فرق مراتب کی معرفت حاصل نہ ہو۔ اس کو قرآنی اصطلاح میں ایتاء ذی القربیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ [2]

اخلاق کی غرض و غایت

اخلاق کے فلسفہ میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اخلاقیات کا دائرہ کیا ہے۔ یعنی ہم برے کاموں سے کیوں بچنا چاہتے ہیں اور اچھی چیزوں کو کیوں اپنانا چاہتے ہیں اور مبلغین، سنیاسیوں اور عبادت گزاروں کے نزدیک اس کا واحد فائدہ جہنم کی آگ سے نجات اور پھر جنت حاصل کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مبلغ کا خطبہ عموماً جنت کی لذتوں کی ایک لذت بھری کہانی ہوتا ہے۔ لیکن امام صاحب کے نزدیک یہ ایک ادنیٰ اور خود غرض خیال ہے۔ جنت کا حصول اور جہنم سے محفوظ رہنا بلاشبہ تقویٰ کا لازمی جزو ہے ۔ لیکن یہ اعلیٰ بصیرت کا تقاضا نہیں کہ اگر نیک کام صرف اس خیال سے کیا جائے کہ آخر ت میں اس کا دس گنا اجر ملے گا تو یہ نیکیاں نہیں بلکہ تجارت ہے۔ امام صاحب نے اخلاص کے اعلان میں اس مقصد کا اظہار نہایت صاف اور آزادانہ طور پر کیا ہے۔ ان کے خاص الفاظ یہ ہیں: ''رویم کہتا ہے کہ اخلاص کا مطلب کام کا معاوضہ دینا اور آخرت میں کہیں نہ چاہنا ہے''۔رویم کا یہ بیان اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خط النفس خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں، ایک آفت ہے جس کی عبادت جنت کے مزے لینے کی نیت سے کرے وہ مریض ہے۔ عبادت کا مقصد صرف رب کی خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے اور جو شخص جنت کی امید اور جہنم کے خوف سے عبادت کرتا ہے اسے فوری فائدہ کے لحاظ سے مخلص کہا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ ایک جنس پرست ہے۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے نیکی اور بدی کا سبب صرف جہنم ہے۔ گناہ کرنے کے بعد وہ ملامت اور عاجزی کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی حالت بالکل ایسی ہو گی جیسے انسان کو کچھ مالی نقصان ہو لیکن ندامت و ندامت اور عاجزی کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ حالانکہ رنج و غم کی کیفیت جو رب کائنات کی بارگاہ میں زیادہ مقبول ہے ان چیزوں کا نام ہے۔ غزالیؒ کی رائے میں اخلاق کی غرض و غایت اخروی زندگی کی سعادت ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو انہوں نے میزان کی پہلی فصل میں نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''حقیقی اور اصلی سعادت اخروی سعادت ہے اس کے علاوہ کسی اور چیز پر سعادت کا اطلاق یا مجازاً ہے یا خطا (مثلاً دنیا کی وہ سعادت جو آخرت کے باب میں مفید نہیں ہے) یا دنیا کی کسی چیز پر سعادت کا اطلاق صحیح بھی ہے تو بھی آخروی زندگی پر اس کا اطلاق اور انسبت ہے کیونکہ ہم اس دنیا میں اگر کسی

1۔ الحشر،۵۹: ۹

2۔ قادری، سید حسین، ڈاکٹر، امام غزالی کا فلسفہ مذہب واخلاق،ص۳۴۲

3۔ نانوتوی،احسن صدیقی،مولوی،مذاق العارفین ترجمہ احیائے العلوم الدین، دارالاشاعت کراچی، ج۴، ص۴۹۹

چیز کو سعادت کا نام دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ یہ آخروی زندگی کی سعادت کے لئے زینہ ہے اور جو چیز خیروسعات تک پہنچنے کا زینہ اور واسطہ ہو اسے بھی اہم ایک معنی میں خیر اور سعادت کے نام سے پکار سکتے ہیں''۔[1]

لہٰذا ثابت یہ ہوتا ہے کہ اخلاق کی مجلس یا اجتماعی غرض و غایت کچھ نہیں جو شخص کسی مریض کی عبادت اور خبرگیری کرتا ہے یا کسی مجبور اور مظلوم کی ممانت و امداد کرتاہے۔ یا کسی زخمی کا علاج معالجہ یا مرہم پٹی کرتا ہے۔ یا کسی صاحب حاجت و ضرورت کی حاجت پوری کرتا ہے تو اس کی یہ ساری محنت و خدمت اس وقت تک اس کے لئے مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کی نیت اس عمل میں خالص اور پاک نہ ہو اور وہ اس بات پر کامل وثوق اور اعتماد نہ رکھتاہو کہ آخرت میں اسے اس عمل کا صلہ اور جزا ملے گی ۔ اس دنیا میں کسی اچھے عمل سے جو بھی سعادت حاصل ہوگی۔ حقیقت میں وہ مجازی ہی ہوگی اور انسانوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اسے مجازی قرار دیں یا اضافی اور نسبی بایں معنی کہ جو چیز آخروی سعادت تک پہنچاتی ہے۔ اسے بھی ایک معنی میں خیر اور سعادت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ میزان میں غزالی نے تصریح کی ہے کہ جو شخص زنا سے محض اس لئے بچے کہ کہیں اس کے وقار اور عزت کے دامن پر دھبہ نہ آئے تو اسے غفیف اور اور پاک دامن نہ کہہ سکتے۔ اس لئے کہ اس عفت اور پاک دامنی سے رب تعالیٰ کی رضا اور خوشی حاصل کرنے کا مقصد نہ تھا۔ بلکہ محض ایک تجارت اور سوداگری تھی کیونکہ اس نے ایک لذت کو دوسری لذت کی خاطر ترک کیا۔[2]

اسلام سے پہلے مذاہب عالم کی اخلاقی حالت

- **یہودیت کی حالت:**نبی اکرمﷺ کی آمد کے وقت یہودی مذہب چند بے جان رسوم وروایات کا نام تھا جن میں کوئی جان باقی نہ تھی۔ یہ مذہب اپنے عقائد وافکار میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا تھا۔''یہودیوں نے اپنی پڑوسی قوموں کے اثر سے یا غالب وفاتح قوموں کے دباؤ سے، ان کے بہت سے عقائد قبول کرلیے تھے''۔[3]بابل کے تالمود کم عقلی، بدزبانی، اللہ کے حضور جسارت اور گستاخی اور حقائق و مسلمات اور دین وعقل کے ساتھ تمسخر کے ایسے عجیب وغریب نمونوں سے بھری ہوئی تھی جن کو دیکھ کر اس صدی میں یہودی معاشرے کی ذہنی پستی اور مذہبی ذوق کے بگار کا پورا پورا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔
- **عیسائیت کی حالت:** عیسائیت اس دور میں بلکہ اس سے بھی بہت پہلے، اپنے دورِ اول ہی میں انتہا پسندوں کی تحریف، جاہلوں کی تاویل اور رومی نصرانیوں کی بت پرستوں کا شکار ہوگئی تھی۔ حضرت مسیحؑ کی سادہ تعلیمات اور پاکیزہ افکار اس تمام ملبے کے نیچے دفن تھے۔ توحید اور اخلاق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت

1۔ شبلی نعمانی، مولانا، الغزالی،مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، ص۱۵۳
2۔ نورالحسن خان، غزالی کا تصور اخلاق ترجمہ اخلاق فلسفہ الغزالی،ص۱۹۵
3۔ رویلنگ، ڈاکٹر، یہودی تالمود کی روشنی میں، منقولہ، نبی رحمت ﷺ، (از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)، کراچی، مجلس نشرواشاعت، ص ۳۷

کا نور گہرے بادلوں کے اندر چھپ چکا تھا۔ چوتھی صدی کے آخر میں عیسائی سوسائٹی میں تثلیث کا عقیدہ بہت بری طرح سرایت کرچکا تھا۔ ’’عیسائیت سوسائٹی میں بت پرستی اور اس کی نوبہ توشکلیں اور دوسری مشرک و بت پرست قوموں کی اندھی تقلید، مرعوبیت یا جہالت کی بنا پر ان کی ہوبہونقل کا رواج عام تھا‘‘۔[1]

- **سلاطین اور حاملین** مذہب پر اخلاقیات کا اثر عام رعایا پر ضرور ہوتا ہے ۔ اس لیے معاشرے میں بداخلاقی، بے حیائی، اسرافی اور ہوس جیسی عادات سریت کرگئی تھیں۔ لوگ ناجائز طریقوں سے مال کماتے اور بڑے ظلم سے اپنے مسرفانہ لہوولعب اور عیاشیوں میں اڑادیتے تھے۔ مذہب کے عہدوں پر فائز لوگوں کی حالت بھی اخلاقی طور پر بہت خراب تھی۔ مذہب کے نام نہاد ٹھیکداروں کی شکل میں سلاطین اور حاملین کی طرح اپنی رعایا کے حقوق غصب کرنا کردیئے اور ساتھ ساتھ وہ سلاطین وامراء کو غصب حقوق کے نام نہاد سرٹیفکیٹ بھی دیتے تھے اور جواباً انہیں ’’خدائی‘‘ کے نام نہادی اختیارات دے دیئے گئے تھے۔ وہ کھلم کھلا اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔
- **مجوسیت کی حالت:** آرتھر کرسٹن مجوسیت کے بارے لکھتے ہیں کہ:مجوسی(ایران کے پارسی) قدیم زمانے سے چار عناصر کی پوجا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے مخصوص آتش کدے اور مخصوص عبادت گاہیں بنائی ہوئی تھیں۔ آگ کی پرستش اور سورج کی تقدیس کے علاوہ ایمان اور مذہب غائب ہوچکے تھے‘‘۔[2]
- **بدھ مذہب کی حالت:**’’بدھ مذہب جو ہندوستان اور وسط ایشیا میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک اسے بت پرستانہ مذہب میں تبدیل ہوچکا تھا کہ بت اس کے جلوس میں چلتے تھے۔ جہاں ان قافلہ رکتا، وہاں گوتم بدھ کا بت نصب کیا جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک مند تیار ہوجاتا‘‘۔[3] اہل علم اور اصحاب نظر کو اس مذہب اور ا س کے بانی کے بارے میں ابھی تک یہ شبہ ہے کہ آسمان وزمین اور خود انسان کے خالق کے وجود پر بھی ان کا عقیدہ وایمان تھا یا نہیں۔ ان کو حیرت ہے کہ ایمان و عقیدہ کے بغیر یہ عظیم مذہب کیسے قائم رہ سکا۔
- **ہندومذہب کی حالت:** دوسرے مشرقی اور ایشیائی مذاہب میں سے ’’ہندومت‘‘ باقی ہے لیکن اس میں بھی عالم انسانیت کے لیے امن وسکون مفقود ہے بلکہ اس میں تو عدل وانصاف کا وہ قتل عام ہے جس سے انسانیت کے سرشرم سے جھک جاتے ہیں اور پھر ہندوستان کے ’’وید‘‘ کا زمانہ بہت قدیم، ان کے بارے میں تاریخی معلومات انتہائی کم اور ان کے اصلی مقاصد تک پہنچنا اس قدر دشوار ہے کہ ایک طالب اور محقق اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں جتنی تحریف اور تغیر ہوئی ہے، وہ ہندومت کی تحریف کا عشرِ عشیر بھی نہیں، پھر آج

1۔ جیمس ہوسٹن، مسیحیت علم جدید کی روشنی میں، مطبوعہ گلاسکو، ص ۴۰۷
2۔ آرتھر کرسٹن، ایران بعہد ساسانیان، مترجم ڈاکٹر محمد اقبال انجم ، دہلی، ترقی اردو بورڈ، ص ۱۵۵۔۲۳۳
3۔ ایشوراٹوپا، ہندوستانی تمدن، مطبوعہ حیدر آباد، دکن انڈیا،ص۲۰۹ Jaqahar Lala, pandat, Discovery of india , Calcutta, 1946, pg. 61

تک ہندومت کے ویدوں اور پروہتوں نے اسے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا، چنانچہ نہ ان کا فکر تصور معین ہے اور نہ عملی تعلیمات واضح ہیں۔ فرانسیسی مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان ''تمدن ہند'' میں لکھتا ہے: ''جرائم کی اہمیت اور ان کی سزا کا تعین ان سے ہونے والے نقصانات کے مطابق نہیں ہوتا، بلکہ مجرم یا مظلوم کی ذات کے حساب سے ہوتا ہے، مثال کے طور پر: برہمنوں کو کسی بھی صورت میں اس طرح سزا نہیں دی جاتی جس طرح دوسری ذاتوں کو دی جاتی ہے۔''[1] عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں:''اگر ملزم اعلیٰ ذات کا فرد ہوتا تو ا سکی سزا ادنیٰ ہوتی اور اگر ادنیٰ طبقے کا فرد ہوتا تو اس کے لیے سزا شدید تر ہوتی''۔[2] ملک غلام اکبر اپنی کتاب ''راجپوت تاریخ کے آئینہ میں'' ہندوؤں کے نظریہ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''برہمن خود بات نہیں کرتا،لیکن اپنی زبان سے خدا خود مردوں سے بات کرتا ہے ''۔[3] نامور عرب مورخ البیرونی لکھتےہیں: ''سفید رنگ، ''برہمن'' کا علامتی رنگ سمجھا جاتا تھا جبکہ ''کھشتری''اور ''دیش'' ذات کا رنگ سرخ اور ''شودر'' ذات کا سیاہ رنگ علامتی نشان کے طور پر سمجھا جاتا تھا''۔[4] مشہور عرب سیاح ''ابن بطوطہ''نے بھی اپنے سفر نامہ ہند کے چشم دید مشاہدات تاثرات میں اسی طرح کی تفصیلات درج کی ہیں بلکہ ایک مقام پر تو وہ لکھتے ہیں کہ ''میں ہندوستان کا مذہبی ظلم وستم دیکھ کر بے ہوش ہوگیا جس وقت ''ستی'' کی رسم ادا کی جارہی تھی''۔[5]

- **قدیم عرب کے احوال:** جہاں تک ان عربوں کا تعلق ہے جو عہد قدیم میں دین ابراہیمی کے حامل تھے، وہ بھی شرک وبت پرستی میں بہت آگے نکلے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہوں نے بہت سے معبود تجویز کرلیے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ خود ساختہ معبود کائنات کے نظم ونسق میں اللہ کے ساتھ شریک ہیں اور نفع ونقصان پہنچاتے ہیں۔ زندہ رکھنے اور مارنے کی صلاحیت وقدرت رکھتے ہیں ، چنانچہ عرب کی پوری قوم بت پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر قبیلے اور علاقے کا علیحدہ علیحدہ معبود تھا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر گھر صنم خانہ تھا۔ حتیٰ کہ خود کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے۔
- **متمدن ممالک کے احوال:** یہ ان مذاہب کا حال تھا جو اپنے اپنے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے آئے تھے۔ جہاں تک ان مہذب ممالک کا تعلق ہے جہاں عظیم حکومتیں قائم ہوئیں، مذاہب مکمل طور پر مسخ ہو گئے اور اپنی حقیقی قدروقیمت اورقوت وافادیت کھو بیٹھے اور مصلحین ومعلمین دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ کیا مشرقی رومی سلطنت اور بازنطینیت، کیا ایرانی شہنشاہی ومزدکیت

---

1. گستاؤلی بان، تمدن ہند، مترجم سید علی بلگرامی، کراچی، بک لینڈ، ص ۲۲۷
2. عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ص ۱۶
3. ملک غلام اکبر، راجپوت تاریخ کے آئینہ میں، العقاب پبلی کیشنز لاہور، ص۲۷
4. البیرونی، کتاب الہند، مترجم سید اصغر علی، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ص۴۰۷۔۴۰۶
5. ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، لاہور، ص۳۸ منقولہ: ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، (از محمد اشرف، مترجم قمر الدین)، لاہور، فکر ہاؤس، ص ۲۵۱

اور کیا ہندوستان وجزیرہ نمائے عرب اور کیا یورپ و مغرب ، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، ظلم ہی ظلم اور وحشت ہی وحشت تھی۔ چھٹی صدی عیسوی جس میں حضور اکرمﷺ کی ولادت ہوئی، تاریخ کا بدترین دور تھا۔ پوری قوم تباہی کی راہ پر تیزی سے گامزن تھی۔ ان میں اچھے برے کی تمیز اور زشت و خوب کی صلاحیت نہ تھی۔ سیدابوالحسن علی ندویؒ اپنی کتاب ''نبی رحمت'' میں لکھتے ہیں کہ''بعض اوقات پورے ملک میں کوئی بھی ایسا بندہ نظر نہیں آتا جس کےدل میں انسانیت کا درد ہو اور اس کے خوفناک انجام اور تاریک پر فکر ہو''۔[1]

اسلام اور اخلاقی تعلیمات

قرآن مجید دنیا کی وہ عظیم کتاب ہے۔ جس نے انسانی زندگی کے معاشرتی پہلو پر سب سے زیادہ توجہ دی اور سب سے اچھے طریقے سے یہ سمجھایا کہ قوم کی زندگی میں کس طرح کے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخلاقیات کے اصول کیا ہیں اور ان کا ماخذ کیا ہونا چاہیے یہ پوری کتاب فلسفہ اخلاق پر بحث کرتی ہے۔ مثالیں دیتی اوراصول مقرر کرتی ہے۔ یہ ایک مکمل ترین ضابطہ حیات ہےجس کی حیات انسانی پر پوری نظر ہے۔ اخلاق جس سے قرآن مجید بحث کرتا ہے۔ ایک باقاعدہ علم ہے اور فلسفہ کی اہم شاخ ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کے سامنے خیروشر اور نیکی بدی کا پیمانہ کیا ہوناچاہیےیہ علم انسان کو جبری طور پر نیک نہیں بناتا۔ بلکہ اسے نیکی کی افادیت واضح کرتا ہے۔ یہ علم انسان کو اچھے برے کی تمیز سیکھاتا ہے۔ اب آگئے انسان کو قوت ارادی کا کام ہے۔ علم اخلاق کے مطابق چلے یا نہ چلے۔بے شک دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اخلاقیات پر ہے اور محمدﷺ کی بعثت کا مقصد بھی اعلیٰ اخلاقیات کی تکمیل تھی۔ خود حضوراکرمﷺ نے ارشاد فرمایا: [بعثت لاتمم حسن الاخلاق]۔ [2] ''بے شک مجھے حسن اخلاق کی تکمیل کےلیے بھیجا گیا ہے''۔ مختلف احادیث میں اس سےواضح بیان ہے: نبی کریمﷺنے فرمایا:[انما بعثت لاتمم مکارم اخلاق] [3]''مجھے تو صرف اس(مقصد)کے لیے مبعوث کیا گیا کہ اخلاقی اقدار کی تکمیل کر سکوں''۔ حضورﷺ خود اخلاقی کمال کا مظہر تھے اور انہوں نے آتے ہی یہ فرض ادا کرنا شروع کردیا۔ ایک موقع پر حضور اکرمﷺ فرمان ہے: [اکمل المومنین ایماناً احسنم خلقاً] [4] ''کامل ایمان وہ ہے جس کا اخلاق بہترین ہو''۔ لہٰذا اسلام میں فلسفہ اخلاقیات، شخصی و قوی اخلاقیات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ پورے قرآن کریم میں اخلاقیات کی تعلیم پر بحث موجود ہے۔ [5]

دنیا میں ایسا کوئی مذہب نہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کےعلاوہ کسی چیز کو اخلاق کا سرچشمہ تسلیم کرے۔ لیکن اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اپنے عبادت گزاروں کی فطرت میں ودیعت رکھی ہےتاکہ فطرت اگر خاموش رہے تو احکام الٰہی کی آواز اس کو پکار کر

1۔ ندوی، ابوالحسن علی ، سید، مولانا، نبی رحمتﷺ، مجلس نشرواشاعت کراچی، ص۵۸
2۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع باب حسن الخلق،حدیث:۱۵۴۴
3۔ حسام الدین، علاء الدین علی متقی، کنزالعمال،ادارہ اشاعت کراچی، ج۱،ص۵
4۔ احمد بن حنبل،مشکوۃ المصابیح،ج۲،باب الرفق والحیاء و حسن الخلق، حدیث: ۱۰۱۱
5۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۴ء، ج۶، ص ۳۲۱

ہشیار کردے۔ یہ نظریہ باہم کس قدر مختلف ہونے کے باوجود باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذاللہ تعالیٰ کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات ضمیر، فطرت وجدان اور عقل سب ہیں۔ اس طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی اتفاق ممکن ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کے محض اپنی فطرت یا ضمیر کے اصرار سے مجبور ہو کر ایک خام انجام دے۔ یااپنا فرض سمجھ کر انجام دے یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو۔ اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب مہمیں ایک کام میں مجتمع ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت بھی ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضہ ہے اور وجدان بھی اس طرح اس کام اچھا کہتا ہے۔ ساتھ ہی اس کی اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں۔ ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے۔ بے شک ایسے بہت سے مواقع بھی ہوسکتے ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ ضمیر ،فطرت ،جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسندی اور مصلحت شناش عقل دوسری طرف جارہی ہے۔ اس لئے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے۔ اصلاح کے لائق ہےمحمدﷺکی تعلیمات میں اخلاق کے ان اصولوں پر کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیے گئے ہیں۔ لیکن وہ یہ نکتہ نہیں بھولے کہ اخلاقیات کا معیار اس کےفلسفے کے علم میں نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال میں ہے۔ لہٰذا عمل کے بغیر علم کی کوئی قدروقیمت نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ عمل بلاعلم کو بھی پسندیدہ نہیں سمجھا ہے۔[1]

اسلامی اخلاق کے اصول

- **بے غرضی:** اخلاق ایک مذہبی عبادت ہے۔ اس لئے ہم جو کام بھی کریں وہ ہر قسم کی دنیاوی ، جذباتی اور ذاتی مقاصدسے پاک ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں۔ مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں جس قدار اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے۔ اسی قدر وہ فعل قابل قدر ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کسی مہمان کتنی ہی خاطر تواضح کریں۔ اگر مہمان یا دوست کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس خاطر تواضح کی تہہ میں ذاتی غرض مضمر ہے۔ گو اس خاطر تواضع کی اس کی نظر میں کوئی قدروقیمت نہ ہوگی۔ اس کے برعکس اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ سادہ کھانا ہی رکھ دیں تو اس کی قدروقیمت کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات میں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہونگے۔[2]
- **نیت:** حضور ﷺنے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ

1۔ ندوی، سید سلیمان ،مولانا، سیرۃ النبیﷺ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، ج۶، ص۴۱،
2۔ ندوی، سید سلیمان ،مولانا، سیرۃ النبیﷺ،ج۶،ص۴۴

کوئی جذبہ برا نہیں لیکن اس کا کثرت سے استعمال برا ہے۔ بخاری شریف میں ہے:[انما الا عمال بالنیات][1] ''انسانوں کے اعمال کا دارومداران کی نیت پر ہے''۔ گویا اچھا یا برا اخلاق اس کی نیت پر منحصر ہے۔ اگر نیک نیت نہ ہو تو بظاہربظاہر بڑے سے بڑا اخلاقی کام بھی اچھے کردار کے دائرے سے باہر ہوجاتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہےجس پر اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں شروع سے آخر تک بحث کی گئی ہے۔ جس عمل کی نیک نیتی شامل نہ ہو اس کی کوئی اخلاقی قدر نہیں۔ اسلام میں خود عمل کی ضرورت نہیں بلکہ اس عمل کی ضرورت ہے جس کی نیت درست ہو۔ نیت کی استقامی کیفیت میں اگر کسی وقت عقل، حکمت اور قوتِ فیصلہ ختم ہوجائے اور بدی کا جذبہ انسان کو کسی بے حیائی پر آمادہ کردے تو پھر بھی استحکام نیت اور نیت نیک کی وجہ سے مزید نفرت سے بچنے کے لیے ثابت قدمی باقی رہتی ہے۔[2]مثال کے طور پر راستے پر جاتے ہوئے ایک عورت سامنے سے نظر آجائے او رکوئی شخص اس کا بیگانہ اور غیر سمجھ کر بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی تو اس صورت میں اس کا دل گناہ گار ہوچکا۔ اس کے برعکس اگر اس نے کسی غیرعورت کی طر ف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے حالانکہ وہ اس کی بیوی نہ تھی تو اس کا دل گنہگار نہ ہوگا۔

نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر وہ بھی دیکھاوے اور نمائش کے لئے ادا کی جائے تو وہ ثواب کے بجائے عذاب کا سبب بنے گی۔ اگر کسی معذور کی امداد اس لئے کریں کہ آپ کی تعریف کی جائے تو اسلام میں یہ نیکی شمار نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں ارشاد فرمایا:﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِہٖ مِنْھَاۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ نُؤْتِہٖ مِنْھَا﴾ [3]''اور جو دنیامیں انعام چاہے ہم اس میں سے اسے دیں اور جو آخرت کا انعام چاہے ہم اس میں سے اسے دیں''۔ لہٰذا نیک نیتی اسلام میں ایک ایسا فرض ہے جو ہر حال میں لاگو ہوتا ہے ، یہ تمام خوبیوں کی اعلیٰ ترین اخلاقی بنیاد ہے اور سب پر غلبہ رکھتا ہے کیونکہ کسی بھی عمل کو اس وقت تک اخلاقی اور صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ اسے کرنے والے کی نیت درست نہ ہو اور نیک نیت اس فعل کا بنیادی عنصر نہ ہو۔ خلق حسنہ کی بنیاد نیک نیتوں سے شروع ہوتی ہے اور یہی اس کی بنیاد ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: ''یہ سب کے لیے یکساں ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اگر اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے۔ اور جس ہجرت کی وجہ مال وزر کمانا یا کسی عورت کوپانا اس لیے ہو کہ وہ اس سے نکاح کرے تو یہ ہجرت اسی کی طرف ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی تھی''۔[4]

1۔ بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری،کتاب الایمان والنذور، باب النیہ فی الایمان، حدیث : ۶۶۸۹

2۔ ندوی، سید سلیمان ،مولانا ،سیرۃ النبیﷺ،ج۲،ص۱۹۰

3۔ ال عمران،۳: ۱۴۵

4۔ صحیح بخاری،کتاب النکاح، باب من ہاجرأوعمل خیرالتذویج امرأۃ فلہ مانوی، حدیث: ۵۰۷۰

علم،صدق، صبر،قناعت،ضبط نفس، ہمت ،عفت،دیانت وغیرہ ایسے اخلاق ہیں۔ جن کی قیمتیں تخمینہ سے زیادہ ہیں۔ لیکن اخلاق کی فہرست میں شامل ہیں۔ جب نیک نیتی ان کے ساتھ ہو۔ اچھی نیت کے بغیر یہ صفات غیراخلاقی ثابت ہوتی ہیں۔ الغرض عمل کا نیک ابد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لئے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسن خلق کے دائرہ سے خارج ہوجاتا ہے اور روحانی خیروبرکت سے محروم رہ جاتا ہے۔

اخلاق کے لئے ایمان کی شرط

اخلاق کے لئے ایمان کا ہونا اولین شرط ہے۔ یعنی یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ایسی ذات ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو جگہ جگہ سے جھانک رہی ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہیں اور جس حال میں بھی ہیں وہ ذات دال کی تہہ کو ہزاروں میں بھی دیکھ رہی ہے۔ دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں۔ مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے۔ اس بات کا بھی پختہ یقین دل میں ہو کہ ہم کو اس ہستی کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ ایک دن ایسا ضرور ہوگا جب ہمیں اپنے عملوں کی جزا وسزا ملے گی۔ جس وقت تک یہ دو خیال دل ودماغ میں جاگزین نہ ہونگے اچھے اعمال کو وجود قطعی محال ہے۔ اسی لئے وحی محمدﷺنے اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان لانے کو ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دیاہے۔ [1] ارشاد خداوندی ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰیۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَا لَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ [2]’’اے ایمان والو! اپنی خیرات کو اس شخص کی طرح ڈھونڈنے یا ستانے میں ضائع نہ کریں جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا‘‘۔سورہ النور اسی مفہوم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔـا﴾[3]’’اور جن لوگوں نے کفر اختیار کرلیا ان کے اعمال اس ریت کے مانند ہیں جو چٹیل میدان میں ہو اور پیاسا اسے دیکھ کر پانی تصور کرے اور جب اس کے قریب پہنچے تو کچھ نہ پائے‘‘۔

غرض و غایت

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے۔ بلکہ اسلام اس سے بحث کرتا ہے کہ اسلام کی غرض وغایت کیا ہونی چاہیے، کیونکہ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں تو اس کی متعدد غرض وغاتیں ہوسکتی ہیں۔جیسا کہ جب ہم کسی بوڑھے کی گردن سے وزن اتار کر خود اٹھالیتے ہیں اور اسے باآرام گھر پہنچا دیتے ہیں یہ کام کی غرض یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بوڑھا گھر پہنچ کر مزدوری دے گا۔ یہ مقصد بھی ہوسکتا ہے کہ لوگ دیکھ کر تعریف کریں گے۔ دیندار نیک سمجھیں گے اور یہ غرض بھی ہوسکتی ہے کہ اگر آج جوانی میں بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑھاے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے۔ بعض کو بوڑھے پر

---

1. ندوی، سید سلیمان ،مولانا ، سیرۃ النبیﷺ،ج۶، ص۴۸
2. البقرہ،۲: ۲۶۴
3. النور،۲۴: ۳۹

ترس آتا ہے۔ اس غرض سے اس کا بوجھ بڑاتے ہیں۔ غرض یہ ایک ہی کام کی مختلف غایتیں ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسیاتی غرض و غایت سے پاک ہے اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے۔ کسی مالی، جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے۔یہ بالکل فطری بات ہے کہ کوئی انسان کسی سے کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے۔ مگر جب اس کو معلوم ہوجائے کہ اس کے دل میں فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدروقیمت اس کی نگاہوں میں گرجاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہوجاتا ہے۔[1]

ضمیر کی آواز

اسلام نے اچھے اخلاق کا ایک اور اصول بیان کیا ہے۔ جسے ہم انسان کی نفسیاتی کیفیت اور اندرونی آواز کا زندہ احساس کہہ سکتے ہیں یعنی وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرلیتا ہے۔[2] چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔''یعنی جب آپ کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کرنا چاہیں تو اپنے دل و جان سے پوچھ لیں اور سمجھ لیں کہ نیکی ایک ایسا عمل ہے جس کے کرنے کے بعد دل اور آنکھوں میں اطمینان کا احساس ہوتا ہے اور گناہ ایک عمل ہے جسے کرنے میں آپ کے دل میں کھٹکھٹارہتا ہے اور انتشار کا باعث بنتا ہے ، حالانکہ لوگ آپ کو کہتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز ہے''۔[3]

یہی اخلاقی احساس ہے جسے لوگوں نے ضمیر کی آواز قراردیا ہے۔وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتاہے۔ جس کو وحی محمدﷺ نے نفس لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) کہا ہے۔ سورہ الشمس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ [4]''انسانی نفس کو نیکی و بدی کی پرکھو کا ملکہ بخشا گیا ہے''۔ ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾[5]''اور برائیوں پر ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں''۔ نواس ابن سمعان انصاریؓ نے حضورﷺ سے نیکی اور بدی کی حقیقت دریافت کی تو حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور بدی وہ جو تیرے قلب میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کا کو لوگ جانیں''۔[6]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر شخص میں خودداری ہے اور ضمیر کا راستہ غلط پایا جاتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اب بھی بہت سے لوگ بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ جواب یہ ہے کہ ضمیر احتجاج کی آواز اٹھاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اس پر توجہ نہیں دیتے، جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اسے ندامت محسوس ہوتی ہے۔اس کے ذکر سے اس کی پیشانی عرق عرق ہوجاتی ہے۔ یعنی جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی آواز کو دباتا جاتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے۔ یعنی بداخلاقی ایک زہر

---

1. ندوی، سید سلیمان ،مولانا ، سیرۃ النبیﷺ،ج۶،ص۵۱
2. اردو دائرہ معارف اسلامیہ،ج۲، ص۱۹۱
3. مسند احمد بن حنبل،حدیث: ۱۸۰۰۶
4. الشمس، ۹۱: ۸
5. القیامۃ،۷۵: ۲
6. ندوی، سید سلیمان ،مولانا، سیرۃ النبیﷺ،ج۶ ،ص۵۴

ہے اور بار بار کی بداخلاقی سے یہ نفس لوامہ (ضمیر) آخر افسردہ یا ہلاک ہوجاتا ہے اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہوجاتا ہے۔[1]

رضائے الٰہی کا حصول

اسلام دین فطرت ہے۔ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں ہرقسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے۔ وہ رب کریم کی خوشنودی و رضا مندی کا حصول ہے۔ ایک سچے مسلمان کو رضائے الٰہی کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ انسان کے پاس دودویقیں ہیں۔ جان و مال، ان دونوں کو رب کریم کی راہ میں دینا ایثارو حسن عمل ہےسورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوتا ہے:﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْـتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾[2]''اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لئے بیچ ڈالتے ہیں''۔ ﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ [3]''اور نیکی مثال جو اپنی دولت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے خرچ کرتے ہیں''۔سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا:﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [4]''اور جو بھی یہ سارے کام رضائے الٰہی کی طلب میں انجام دے گا ہم اسے اجرعظیم عطا کریں گے''۔حضور ﷺ کی احادیث سے بھی ان آیات تفسیر و توضیح ہوتی ہے۔ نبی کریمﷺ سے ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ کوئی اس لئے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے کوئی بہادر کہلانے کے لئے اور کوئی اس لئے کہ شہرت حاصل ہو۔ ان میں سے راہ اللہ تعالیٰ میں لڑنا کس کو کہیں گے۔ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کو جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بات بلند ہو''۔[5]غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منعقت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے۔

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

توراۃ نے اپنے اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے۔ جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گنہگار پیدا ہوتا ہے اور گناہ اس کا مایہ خمیر ہے۔ کیونکہ حضرت آدم اور حواء گناہ گار تھے اور یہ موروثی گناہ ہرانسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ جس سے بچنا انسان کے لئے ممکن نہیںلیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جدا گانہ ہے۔اسلام میں نہ گناہ اور بدخلقی اس کا مایہ خمیر ہے۔ وہ اپنی مخلوق میں سادہ اور پاک ہے اور اس کی فطرت میں ہدایت و صحیح الہام ہے اور اسے بہترین راستے پر پیدا کیا گیا ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ [6]ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے''۔ اس

---

1. ندوی، سید سلیمان ،مولانا، سیرۃ النبیﷺ،ص۵۳،ج۶
2. البقرہ،۲: ۲۰۷
3. البقرہ،۲: ۲۶۵
4. النساء،۴: ۱۱۴
5. صحیح بخاری کتاب الجہاد،ج۱،حدیث ۱۲۶
6. التین،۹۵: ۴

طرح ایک حدیث میں فرمایا: [مامن مولود الا یولد علی القطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ اؤ لمحبسانہ][1] ''انسان کی فطری پیدائش سلامتی پر ہوتی ہے۔ لیکن والدین کی تربیت اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی وغیرہ بنادیتی ہے''۔انسان کی فطری پیدائش سلامتی پر مبنی ہے۔ لیکن والدین کی تربیت اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی وغیرہ بنا دیتی ہے۔" گویا انسان اپنی اصلی فطرت میں معصوم اور بے عیب پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ اپنے اوپر کوئی گناہ یا بوجھ لے کر اس جہان میں آتا۔ نہ ہی اس کی پیدائش دوسرے جنموں کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کفارہ اور تناسخ جیسے مسائل نہیں ہیں، نہ اس میں کسی ابن اللہ کا تصور ہے۔ [2]

اسلام یہ بھی بتاتا ہے کہ بداخلاقی کے ارتکاب کے وقت انسان اپنی فطرت کے اصولوں کا غلط استعمال کرتا ہے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے۔ برے کاموں کی طرف نفس کی کشش اور میدان انسان کی فطرت کے خلاف ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے بعض بچوں کو چھپ کر مٹی کھانے کی عادت ہو جائے۔ لیکن اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عبادت اور علم کی طرف روح کی کشش ہے۔ جیسے کھانا پینا کیونکہ یہ فطرت کے عین مطابق ہے اور عین دل کی آواز ہے اور دل کیا ہے۔ یہ امرالٰہی ہے جس کے نتائج شہوت کی طرف مائل ہیں اور یہ اس کی حدود سے باہر ہے اور اس پر عارضی ہے''۔[3]

خوف ورجا

اسلام نے اخلاقیات کا یہ اصول بھی واضح کیا ہے کہ اچھے اعمال برائیوں کا دفعہ کرتے ہیں اور انہیں نست ونابود کردیتےہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْہِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾[4]''بے شک نیکیاں برائیوں کومٹادیتی ہیں''۔﴿اِنَّ اللہَ یَغْفِرُالذُّنُوْبَ جَمِیْعًا﴾[5] ''بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دے گا''۔بداخلاقیوں کے بارسے دبی ہوئی دکھی دنیا کے لئے یہ بڑی خوشخبری ہے۔ کچھ یونانی فلسفی ہر واقع سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ نکالتےہیں ۔ ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو۔اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں نظریے غلط ہیں۔ پہلا نظریہ انسان کے تمام قوی کو سست اور یخ بستہ کردیتا ہے اور دوسرا نظریہ اباحت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ لیکن اسلام کا دین فطرت ہے۔ افراط تفریط سے پاک ہے۔ اسلام کے فلسفہ اخلاق کی شاہراہ افراط و تفریط کی ان دونوں راہوں کے بیچ میں سے نکلتی ہے اور خوف ورجا کے درمیان ہے۔اسلام کے انسان کے دل میں بیم و رجا دونوں کی کیفیتیں یکجا کی ہیں۔ گناہوں اور کوتاہیوں کی باز پرس کا خوف بھی اور رحمت الیہ کی امید کا سہارا بھی۔ یہ ڈرا سے غافل اور بے با ک نہیں ہونے دیتا اور یہ امید اسے مایوس اور شکستہ خاطری سے بچاتی ہے۔ اسلام میں ناامیدی گناہ ہے۔ حضور ﷺ انے انسان کو ہمیشہ پر امید رہنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز باب اسلم الصبی سمات،ج۱، ص۱۸۱، حدیث ۱۲۹۶
2۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ،ج۲، ص۱۸۹
3۔ احیائے العلوم الدین،ج۳،ص۶۹
4۔ ہود،۱۱:۱۱۴
5۔ الزمر،۳۹: ۵۳

کی تاکید کی ہے۔ آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں''۔[1]

یعنی جس طرح وہ میری نسبت خیال کرتا ہے وہی اس کے لئے ہوجاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾[2] ''کہ تم رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا''۔ تمیز اسلامی قوموں میں آئے دن ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیوں کا عام رواج ہے۔ ہندوستان میں ہندوعورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں۔ یورپ ارو امریکہ میں ناامید پر خود کشی کرلینا ایک معمول واقعہ بن گیا ہے۔ لیکن اسلام ناکامی پر ناامید ہونے کی نفی کرتا ہے۔

اخلاق اور رہبانیت

اسلام کی اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ طبعی جذبات کو کچلنا خوبی نہیں اور رہبانیت اور ترک دنیا ممنوع ہے۔ بعداز نبوت آنحضرت ﷺ نے اپنی پوری زندگی اس انسانی معاشرے میں رہ کر اور تمامتر انسانی جدوجہد میں شریک ہوکر گزاری۔ یہی طرز عمل خلفائے راشدین کا تھا۔ پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔تجرد، علیحدگی،خلوت نشینی، ترک عمل اور ترک جماعت کے لئے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں۔[3] ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ ِابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾[4]''اور ان کا اتباع کرنے والوں کے دلوں میں مہربانی اور محبت قرار دے دی اور جس رہبانیت کو ان لوگوں نے ازخود ایجاد کرلیا تھا اور اس سے رضائے خدا کے طلبگار تھے اسے ہم نے ان کے اوپر فرض نہیں قرار دیا تھا''۔ارشاد نبویﷺ ہے: [لارھبانیہ فی الاسلام] [5]''اسلام رہبانیت کی اجازات نہیں دیتا''۔حضورﷺ نے تمام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا: [کلم راع وکلم مسؤل عن رعیتہ] [6]''تم میں سے ہر شخص اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور(قیامت کے دن)اس سے اپنی رعایا سے متعلق بازپرس ہو گی''۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بلند ہوگئے ہوں کہ بجھائے نہ جاسکیں اور اپنے میں اس آگ کو بجھانے کی طاقت نہ پائیں تو وہ مجمع سے الگ ہوجائیں اور جو اس آگ کو بجھانے کی طاقت رکھتا ہو۔ اس پر تبلیغ اور مرمعروف کرنا فرض ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان پاک ہے: ''بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

1۔ جامع ترمذی،کتاب الزہد، باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ، جلد دوم، حدیث ۲۷۷
2۔ الزمر،۳۹: ۵۳
3۔ ندوی، سید سلیمان ،مولانا، سیرۃ النبیﷺ،ج۶،ص۷۷
4۔ سورۃ الحدید،۵۷: ۲۷
5۔ مسند احمد بن حنبل،ج۶،ص۲۲۶
6۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح وکتاب الجنائز بات یعذب المیت ببکاؤ اھلہ،ج۱،حدیث ۸۵۹

اگر ہاتھ سے نہیں مٹا سکتا تو زبان سے مٹانے کی کوشش کرے۔ اگر اتنا بھی نہیں کرسکتا تو اسے دل سے برا سمجھے یہ سب سے کمزور ایمان ہے''۔[1]

امربالمعروف ونہی عن المنکر

اسلامی فلسفہ اخلاق کا یہ امتیازی وصف ہے کہ یہ معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹا کا حکم دیتا ہے۔ یہ اخلاق کی معراج ہے۔ اسلامی فلسفہ اخلاق انسانیت کو ایک ایسا نظام زندگی قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے جس کی بنیاد اچھے اور برے سے پاک ہو۔اچھی باتوں کے لئے کہنا اور بری باتوں سے روکتا قرآ ن پاک نے مسلمانوں کا ممتاز وصف قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[2] ''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظرعام پر لایا گیا ہے تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو''۔ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:﴿يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[3] ''جو خیر کی دعوت دے، نیکیوں کا حکم دے۔ برائیوں سے منع کرے''۔ یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصولوں کو نمایاں کرتی ہے اور قوی ہمت اور قوی دل افرار کا فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔تورات میں قابیل کا یہ فقرہ لکھا ہے کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں''۔

جو عیسائی مذہب کے اخلاق کا اہم اصول ہے۔ جس کی روسے ہر شخص آزاد ہے۔ لیکن اسلام نے ہر شخص کو اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا ہے۔ حضور ﷺکا فرمان ہے: تم میں سے ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ دار لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی۔ قرآن پاک میں بھی لوگوں کو صراحت کے ساتھ نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا ہے۔ تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف لوگوں کی نیک چینی کا ضامن ہوسکے۔ اسلام کی نظر میں ایک مسلمان کا اپنے دوسرے بھائی کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا بہت اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا ایک ایسا ضرور حصہ ہے کہ اگر اسے ادا نہ کیا جائے تو بھی ایسا ہی گنہگار ہے۔ جیسے اس فعل کا کرنے والا۔

بظاہر اخلاقی امور ہر شخص کے لئے پرائیویٹ اور نجی معاملات معلوم ہوتے ہیں۔ جس کا نفع و نقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے۔ مگر ذرا گہرائی میں دیکھنے سے معلوم ہوگا اس کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو لوگ برائی کو معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ لوگ برائی کو برائی ہی نہیں سمجھتے جس کے نتائج میں چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہوجاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گرجاتی ہے۔[4]

ٹوہ لگانے اور غیبت کی ممانعت

1۔ صحیح مسلم کتاب الایمان،حدیث ۱۷۹
2۔ ال عمران،۳: ۱۱۰
3۔ التوبہ،۹: ۷۱
4۔ ندوی، سید سلیمان ،مولانا، سیرۃ النبیﷺ،ج۶، ص۸۰

اسلام نے دوسرؤں کے ذاتی معاملات کی تحقیق و تفتیش کرنے کی ممانعت کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے گھر گھس کر اس کی حالت و کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اس طرح فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس ممانعت کا اصل فلسفہ یہی ہے کہ جو شخص گھر پر چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے۔ اس کے اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جو شخص مخفی گناہ کرتا ہے تو گویااس میں شرم وحیاء کا جوہر ابھی موجود ہے جو ممکن ہے اس کی ہدایت کا سبب بن جائے۔ اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھیں گے تو ڈر ہے کہ وہ ہٹ دھرمی اختیار کرے اور یہ شرم وحیاء کی چنگاری بھی گل (بجھ) ہوجائے۔اور نہ کسی کی برائی دوسروں کے سامنے بیان کی جائے کیونکہ یہ اصلاح کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اس سے برائی کرنے والے کے دل میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے گی اور اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوجائے گا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّۖ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًاؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ﴾[1] ''ایمان والو اکثر گمانوں سے اجتناب کرو کہ بعض گمان گناہ کا درجہ رکھتے ہیں اور خبردار ایک دوسرے کے عیب تلاش نہ کرو اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کرو کہ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے یقیناً تم اسے برا سمجھو گے تو اللہ سے ڈرو کہ بیشک اللہ بہت بڑا توبہ کا قبول کرنے والا اور مہربان ہے''۔ کسی کی غیبت کرنا ایسے ہے جیسے مردہ لاش کا گوشت کھانا۔ جس طرح مردہ اپنے جسم کی حفاظت نہیں کرسکتا وہ بھی جس کو تم اس کی غیرحاضری میں برا کہہ رہے ہو۔ اپنے انرام کی ملاضت نہیں کرسکتا حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگانے پھروگے تو ان کو برباد کردوگے''۔[2]

اعتدال ومیانہ روی:

امت مسلمہ کو امت و سطاً کہا گیا ہے۔ جس میں یہ راز معتمر ہے کہ امت مسلمہ کا راستہ زیادتیوں سے پاک ہے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو نماز یہ پڑھنا سکھایا۔﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَاالضَّآلِّيْنَ﴾[3]''ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت فرما۔ جو اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے نعمتیں نازل کی ہیں ان کا راستہ نہیں جن پر غضب نازل ہوا ہے یا جو بہکے ہوئے ہیں''۔یہاں مغضوب سے یہودی اور انصاری سے عیسائی مراد ہیں کیونکہ انہوں نے افراط وتفریط کا راستہ اختیار کیا اور مسلمانوں کو یہ دعا سیکھائی کہ اللہ تعالیٰ یہودی اور عیسائیوں کے راستہ پر نہ چلائے۔عدل و انصاف کے اصول جو حضرت موسیٰ نے قائم کیے تھے۔ اس کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ نے اپنی اخلاقی تعلیم کو ان الفاظ میں بلند کیا: ''تم نے سنا ہو گا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی سے برائی کا مقابلہ نہ کرو۔ اس شخص کو

1۔ الحجرات،۴۹: ۱۲

2۔ سنن ابی داؤد،کتاب الادب،باب النبی عن التجسس،جلد سوئم، حدیث ۱۴۸۳

3۔ الفاتحہ،۱: ۶۔۷

جو آپ کے داہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال اس شخص کو پیش کریں جو لڑائی کے دوران آپ کے کپڑے پکڑے، اس شخص کو چادر دیں جو آپ سے بھیک مانگنے کے لیے ایک میل دور جائے، اس کو دے دو جو تم سے مانگے اور جو تم سے قرض مانگے اس سے منہ نہ موڑو۔''[1]

یہ اخلاقی تعلیمات نہ قابل عمل اور اعتدال وتوسط سے باہر ہے۔

عدل و احسان

اسلام نے جن اخلاقی اور معاشرتی مسائل پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان میں سے ایک انصاف ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کے ساتھ سلوک کیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔ دنیا کا نظام اسی انصاف پر قائم ہے۔ جس قوم اور معاشرے میں انصاف نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جائے گا اور دنیا میں اس کا انجام بہت برا ہو گا۔ اس طرح کے معنی برابر ہیں۔ یہ انصاف ہے۔ اسے چھوڑ دینا، معاف کرنا، احسان ہے۔قانون عدل کو اسلام نے جماعت یا سلطنت کے ہاتھ میں دیا ہے اور یہ احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔دنیا کے تمام لوگوں میں یکساں صلاحیت نہیں ہوتی، کچھ اچھے، شریف، صابر اور وسائل والے پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے لیے معاف کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہوتا ہے اورکچھ سخت مزاج اور غصے والے پیدا ہوتےہیں۔ جو بدلہ اور اس بدلہ سے بھی زیادہ ہے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے۔ ان کے لئے اسلام نے یہ اصلاح کی کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے زیادتی کے بدلے اتنی ہی زیادتی کے اصول پر اس کو رضا مندکرلیا جائے۔ اس لیے ایک عالمگیر قانون کےلیے جو پوری دنیا کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ عدل اور احسان دونوں قواعد کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

اخلاق اور قانون

دونوں اہداف کا مقصد ایک ہے، لیکن منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔ قانون برائی سے روکتا ہے۔ لیکن اس سے برائی سے نفرت کا کوئی روحانی احساس پیدا نہیں ہوتا جو انسانیت کی روح ہے اور ہر کسی کو اخلاقی طور پر کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس کے ذریعے (یعنی اخلاق کے ذریعے) عدل وانصاف اور برائیوں کو مکمل طور پر نہیں روکا جاسکتا تورات محض قانون ہے۔ انجیل محض اخلاق مگر یہ دونوں عدل و انصاف امن و امان اور برائیوں کی روک تھام میں ناکام رہی ہیں۔ لیکن شریعت محمدﷺ عدل و احسان اور قانون واخلاق کی جامع ہے۔اسلام ان برائیوں سے منع کرتا ہے جو براہ راست دوسروں کو متاثر کرتی ہیں۔ قانون کے تحت مثلاً قتل، چوری، ڈکیتی، غیبت، زنا، چنانچہ قرآن نے ان جرائم کی سزا مقرر کی ہے جو اسلامی حکومت دے سکتی ہے اور جن کا تعلق کسی شخص کے ذاتی نفس کی تکمیل سے تھا۔ اس نے انہیں اخلاقیات کے دائرے میں رکھا،

1. انجیل متی،باب۵،سطر ۳۸

جیسے جھوٹ بولنا، مہربان ہونا، غریبوں کی مدد کرنا وغیرہ۔ اس طرح محمدی شریعت قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

عفوودرگزر کی تعلیم

مسلمانوں کو عفوودرگزر کا درس دیاگیا ہے۔ عفو سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کی غلطیوں اور خطاؤں کو معاف کرنا اور انتقام کی طاقت سے بھی معاف کرنا ۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ عیسائیوں کی طرح معاف کردیا کہ آدمی گال پر مارے تو دوسرا گال بھی پیش کردیا جائے۔ اس سے تو شرپسندوں کو مزید حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ معافی صرف اسی کیفیت میں مناسب ہوسکتی ہے جب غلطی کرنے والا اپنی غلطی پر کسی حد تک پشیمان ہواور اس کو معاف کردینا اس کی اصلاح کا موجب ہو اسلامی اخلاقی میں عفو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔﴿اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْءٍ فَاِنَّ اللہَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا﴾ [1]''کسی برائی سے درگزر کرو تو اللہ گناہوں کا معاف کرنے والا اور صاحبِ اختیار ہے''۔دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللہُ لَكُمْ وَاللہُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[2]''ہر ایک کو معاف کرنا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ خدا تمہارے گناہوں کو بخش دے اور اللہ بیشک بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے''۔ ایک جگہ مومنوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ہُمْ يَغْفِرُوْنَ﴾[3]''اور جب غصہ آجاتا ہے تو معاف کردیتےہیں''۔﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللہُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [4] اور غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والےہیں اور خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: [وما زاداللہ رجلا یفوالاعزا] [5]''رب کریم اسی شخص کو جو عفو سے کام لیتا ہے۔ عزت بڑھا دیتا ہے''۔

اسلام نظریہ اخلاق کا مقصد

اسلامی نظریہ اخلاق انسان کو احساس ذمہ داری سے بھر پور کردیتا ہے ۔ وہ انسان کو ایک بلند ترین مقصد عطا کرتا ہے۔ جس سے اس کی زندگی کا صحیح رخ متعین ہوجاتا ہے اور اس کی حرکت اسی محور کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ وہ مقصد ہے رضائے الٰہی یہ مقصد انسان کو ایک مضبوط چٹان کی مانند کائنات کے حواد ث میں کھڑا کردیتا ہے۔ کوئی خوف، کوئی لالچ، کوئی ترغیب اسے بلند تر مقام سے گرا نہیں سکتی۔ ہر اچھی صفت کا اصل مقام اس کی زندگی میں خود بخود متعین ہوجاتا ہے اور اس بنیاد سے ارتقا کی منزلوں کو طے کرنا شروع کردیتا ہے اور برابر آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سارے رزائل اس کی زندگی سے خارج ہوجاتے ہیں اور وہ حقیقی معانی میں رب تعالیٰ کا نائب بن جاتا ہے۔ یہ مقصد انسانی اعمال وافعال کو تمام اغراض ونفسیانی و مادی خواہشات سے بلند تر کردیتا ہے۔ اس مقصد کو اپنا کر انسان اپنے اصلی مقام کو پالیتا ہے اور غلط روی سے بچ جاتا ہے اور روز مرہ کی زندگی

1۔ النساء،۴: ۱۴۹
2۔ النور،۲۴: ۲۲
3۔ الشوریٰ،۴۲: ۳۷
4۔ ال عمران،۳: ۱۳۴
5۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع باب ماجافی التعفف عن المملۃ، حدیث ۱۷۳۴

میں ایک شریف انسان بن جاتا ہے۔ دوسرے کے ساتھ اس کے تعلقات ایک پاکیزہ بنیاد پر قائم ہوجاتے ہیں۔ غرض اخلاق سے جو اصل غرض ہے وہ صرف اسلامی نظریہ اخلاق سے حاصل ہوتی ہے ورنہ انسان کے افراط وتفریط کمی بیشی میں مبتلا ہوجانے کا خدشہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔[1]

اسلامی نظریہ اخلاق کی امتیازی خصوصیات

اس نظام کی بہت سی امتیازی خصوصیات ہیں۔ لین ان میں تین زیادہ واضح ہیں اور ان کو اس کا خاص تحفہ کہاجاتاہے۔

۱۔ اسلامی اخلاقی نظام میں تنہائے مقصود رضائے الٰہی کا حاصل کرنا ہے۔ جب کوئی شخص اس مقصد کو اپنا لیتا ہے تو اس کا اخلاقی مقام بہت بلند ہوجاتا ہے۔ وہ کسی ذاتی نفع کو حاصل کرے یا کسی نقصان سے بچنے کے لئے اچھا سلوک نہیں کرتا بلکہ وہ ان تمام حدود سے بالاتر ہوجاتا ہے۔ خود غرضی اس کے پاس پھٹک نہیں سکتی مقصد کی بلندی کا لازمی نتیجہ کردار کی بلندی ہے۔ یہ مقصد انسان کو پختگی اور استقلال کی دولت سے مالا مال کردیتا ہے اور اس سے اعمال کی پائیداری وجود میں آتی ہے۔

۲۔ اسلامی نظامِ اخلاق نے نہ تو کوئی مصنوعی تخلیق پیش کی ہے اور نہ ہی یہ کوشش کی ہے کہ انسان کے بعض معروف اخلاق کو گھٹا کر دوسروں کو بلا وجہ بڑھایا جائے۔ وہ ان اخلاقیات کو لے لیتا ہے جو انسانیت کے اجتماعی ضمیر کے ذریعہ معروف اور قبول ہوتے ہیں اور اسلام نے انہیں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ان کے مناسب مقامات پر ترتیب دیا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اخلاقیات کے ہمہ گیر اثرات سے بچ گیا ہو۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہر جگہ اخلاقیات کو حاکم بناتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ زندگی کے معاملات کو خواہشات، مقاصد اور مصلحتوں کے بجائے اصولوں کے ہاتھ میں لے۔

۳۔ اس اخلاق نظام میں تمدنی زندگی کی اصل غرض و غایت ہی یہ قرار دی ہے کہ ﴿ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾[2] اس کی دعوت ان اچھی چیزوں کو قائم کرنا اور ان کی پرورش کرنا ہے جنہیں انسانیت کا ضمیر ہمیشہ بھول گیا ہے اور وہ برائیاں جنہیں انسانیت نے ہمیشہ برا سمجھا ہے۔ اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کو جمع کرکے ایک امت کی تشکیل کی جسے امت مسلمہ کہا جاتا ہے۔ گویا اسلام صحیح معنوں میں فطرت کی آواز ہے جو اپنے نظام اخلاق کے ذریعے سے دنیا کے ہر کونے میں نیکی کو سربلند کرنا اور برائی کو نیست ونابود کرنا چاہتا ہے۔ [3]

تربیت کا ایک ذریعہ تذکرہ نصیحت بھی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔﴿فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ﴾[4]’’تو قرآن کریم سے ان کو نصیحت کر جو

1۔ میاں منظور احمد، اسلامی نظریہ حیات، ص۴۹
2۔ ال عمران،۳: ۱۱۰
3۔ خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات،ص۳۹۱
4۔ ق،۵۰: ۴۵

میرے عذاب سے ڈریں''۔ ﴿وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾[1]''اور سب لوگوں کو نصیحت کیے جا بیشک ایمان والوں کو نصیحت فائدہ دے گی''۔ قرآن پاک میں تربیت کے اس ذریعے کو بھی اختیار کیا ہے۔

اخلاقی تعلیمات کو رائج کرنے کے طریقے

اسلام نے اخلاقی تعلیم دینے کے لیے بہت سے طریقے اپنائے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں اخلاق حسنہ کو اچھی تمثیلوں میں اور رزیلہ اخلاق کو بدصورت اور نفرت انگیز شکلوں میں پیش کیا ہے اور اچھے اخلاق کے اچھے نتائج اور برے اخلاق کے برے نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز فضیلت اخلاق کو الوہیت، بادشاہت اور رسالت کے اوصاف میں اور رزائل کو شیطان کی صفات میں شمار کیا ہے اور انہوں نے ان ضرورتوں کو نہایت خوش اسلوبی سے محسوس کیا ہے جو اعمالِ اخلاق کا محرک ہیں۔افراد اور قوموں کی اصلاح کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اخلاقیات اور قانون دونوں ایک دوسرے کے تکمیلی ہیں۔ اسلامی تعلیم میں یہ دونوں پہلو موجود ہیں اور ان کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک طرف تو اس نے تبلیغی اور دانشمندانہ انداز میں اخلاقی اصلاح اور حقوق کے احترام پر زور دیا ہے اور دوسری طرف ان برائیوں کا مقابلہ کرنے پر جو دوسروں کے حقوق پر براہ راست اثر ڈالتی ہیں۔ چوری، ڈکیتی، قتل اور حملہ وغیرہ کی طرح انہیں براہ راست قانون کے کٹہرے میں لایا گیا ہے اور ان کے لیے مخصوص سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو ایک عمومی اخلاقی ضابطہ کے طور پر برائیوں کے زمرے میں رکھا جائے اور برائیوں سے بیزاری کا روحانی معیار پیدا کیا جائے کیونکہ اخلاقی ذمہ داریاں محض سیاست اور تقریری ضابطوں سے پیدا نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی حالات۔ مجرموں کے دلوں میں پیدا کیا جائے۔ مجرمانہ الزامات کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس قانون کی ایک خصوصیت ہے۔ جسے اخلاقی قانون کہا جاتا ہے اور جو دلوں اور خیالات پر حکومت کرتا ہے۔

۱۔ **ایمان باللہ:** ایک صوفی سے پوچھا گیا وہ کیا طریق ہے کہ ہم منہیات اور بلیات سے طمانیت اور استقلال کے ساتھ آزاد ہوجائیں۔ اس نے جواب دیا ایما ن باللہ (یعنی اللہ پر ایمان)۔اس سے سب کمزوریاں اور آفات سے عملاً نجات پاتا ہے۔ اللہ پر ایمان اسلامی ضابطہ حیات کی بنیاد ہے۔ اللہ پر ایمان دل کو نیک کاموں کے حصول اور برے کاموں سے بچنے کی طاقت دیتا ہے۔ فرشتے اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور وہ گناہ در گناہ سے بچ جاتا ہے اور امن و سلامتی کی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ارشاد خداوندی ہے۔﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾[2] ''اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتے ہیں اور اس عقیدہ پر اعمال صالح اختیار کرتے ہیں۔ وہ ملائکہ کا محبٹ بن جاتے ہیں جو انہیں یہ بشارت دیتے ہیں کہ اب تم خوف وحزن سے نجات پاگئے''۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نہ ماننا اخلاق پر اثر انداز نہیں ہوتا یا اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتا اور ایمان باللہ سے اخلاقی طاقتوں میں کچھ تقویت نہیں آتی۔ اسلام

1۔ الذاریات، ۵۱: ۵۵
2۔ فصلت،۴۱: ۳۰

نزدیک جس قانون اخلاق میں اللہ تعالیٰ پرستی کی ضروری دفعہ نہیں وہ بے دقعت ہے۔ [1]

۲۔ **مکافات:** اخلاق کی درست کے لئے اسلام نے دوسرا اصول مکافات بیان کیا ہے۔ صرف اخلاقیات کے قوانین کا پابند اخلاقی فلاح میں ذاتی ، معاشرتی یا عملی اجتہادات سے کام لیتا ہے۔ لیکن جب اسلام اچھے اخلاقی کی ترغیب دیتا ہے تو یہ بھی بتاتا ہے کہ نہ صرف تہذیب بہتر ہوتی ہے بلکہ اگلی زندگی بھی سنورتی ہے۔ اس حقیقت سے اعمال میں ایک خاص قسم کی صداقت کا اور زور پیدا ہوجاتا ہے۔ قانون مکافات اخلاق کے اصول کی تنقید وتعمیل کے لیے ایک تاربانے کا کام کرتا ہے ۔ جس سے بہت سے لوگ متنبہ ہوکر فائدہ اٹھاتے ہیں۔[2]

۳۔ اسلام نے اخلاقی درستگی کے لیے بندے کی خوبیاں بھی پیش کی ہیں اور اس طرح طرز عمل کے مقاصد کے تعین میں بڑی سہولت پیدا کی ہے۔ خود حضوراکرمﷺ کی زندگی کو قرآن کریم نے بطور اسوہ نمونہ پیش کیا ہے۔ جیسے فرمایا:﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾[3]''تمہارے لئے نبی اکرمﷺ کی زندگی میں اسوہ حسنہ ہے''۔

۴۔ اصلاح اور اخلاقی قانون کے سلسلے میں اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اچھا کردار اور برے کردار کا حامل ہو تو انصاف یہ ہے کہ اس اچھے کردار کی قیمت ادا کی جائے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کی فطرت اور اصلاح کی فطرت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور لوگ آخرکار یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اچھے اور برے میں فرق ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک آنکھ کو دوسری صحت مند آنکھ کی بینائی سے انکار کرنا۔ یہ اصول اتنا غلط ہے کہ بہت سی خوبیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر انسان چند چیزوں میں اچھا ہے اور چند چیزوں میں برا ہے تو برائیوں کو شمار کرنے اور اچھی چیزوں کو چھوڑنے کی کیا وجہ ہے؟ اگر کوئی شخص عام طور پر بد مزاج ہونے کے باوجود کسی شخص کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا ہے تو اسے تسلیم کیوں نہیں کیا جاتا؟ ایسا نہ کرنا غاصبانہ فعل ہو گا، اسی لیے قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے تھوڑی سی بھی نیکی کی۔ وہ اچھائی بھی شمار ہوگی اور تھوڑی سی برائی بھی باب و کتاب میں آئے گی۔

۵۔ اسلام نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اخلاقی قوتوں کا اس طرح اظہار کرے کہ اس کی رونق بڑھے اور لوگ اس سے سرشار ہوں۔ ہر خلق حسن اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن انسان کے طرز عمل سے بھی اس میں بعض اوقات کمی آجاتی ہے اور اس کی قیمت کم ہوجاتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات وہ نیکی ختم ہی ہوجاتی ہے جو بندہ صدقہ و خیرات کرتا ہے۔ وہ ایک عظیم نیکی حاصل کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ صدقہ دیتے وقت احسان جتاتا اور سائلوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ وہ اپنی اس نیکی کو ضائع اور باطل کرتا ہے۔[4] ارشاد باری

1۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ،ج۲،ص۱۹۴

2۔ 1 اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج۲، ص۱۹۴

3۔ الاحزاب،۳۳: ۲۱

4۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ،ج۲، ص۱۹۶

تعالیٰ ہے:﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾[1] ’’اپنے صدقات کو منت گزاری اور اذیت سے برباد نہ کرو‘‘ ۔

۶۔ اسلام نے یہ بھی بتایا ہے کہ اچھے اخلاق اور برے اخلاق کا ایک تسلسل ہے اور ان میں سے ہر ایک قسم کا رشتہ ہے کہ کس طرح ایک چھوٹے سے نقطہ آغاز سے آہستہ آہستہ بڑے تک پہنچتا ہے۔ عظیم حالات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ایک شخص مثلاً دیانت اور پاکیزگی کے باہمی تعلق سے واقف ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں اخلاق کو اس شخص سے زیادہ مؤثر طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کر سکتا ہےجوان دونوں کے باہمی رشتوں سے ناآشنا ہے۔ غرض اخلاق کی آپس میں قربت و یگانگت ہوتی ہے اور ان میں باہم نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ایک نیکی کے اختیار کرنے سے دوسرے برے اخلاق سے بھی طبیعت مانوس ہوجاتی ہے۔ یہی اخلاقی دنیا میں حقیقی ارتقا ہے۔ اسلام نے اس پہلو پر توجہ دی ہے اور اخلاقیات کے باہمی تعلق کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۷۔ اخلاقیات کی ترقی اور ترویج کی تاریخ کے بارے میں اسلام کہتا ہے کہ اخلاقی اقدار فطرت میں مرکوز ہیں۔ لیکن اخلاقی زندگی جامد صورت نہیں رکھتی بلکہ اس میں حرکت ہوتی ہے اور دنیا کی اخلاقی ترقی کا ستارہ رفتہ رفتہ آسمان پر طلوع ہوا اور جیسے جیسے انسانی جذبات، احساسات اور ذہنی قوتیں پروان چڑھی ہیں۔ ویسے اخلاقی حقائق بھی رفتہ رفتہ آشکار ہوتے رہے ہیں۔ دنیا کا پہلا مامور پہلا اخلاقی ضابطہ تھا۔ پھر جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا۔ وہ دور جس میں آدم کا نام دعوت میں رکھا گیا ہے۔ یہ ابتدائی حالت تھی۔ دورِ ثانی میں مزید ترقی ہوئی۔ آخر کار حضرت مسیح ناصری کو بھیجا گیا۔ آپ نے اخلاقی دنیا میں بہت سے بلند پایہ کارنامے سرانجام دیے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ باتیں کہنے کے لیے اس نے بھی یہی کہا۔ لیکن آپ میں ان کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے جب وہ، روحِ حق، آتا ہے۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔ آخر کار یہ جذبہ حق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ظاہر ہوا اور آخری اور مکمل ضابطہ حیات حضوراکرمﷺ کو عطا ہوا۔ حسن خالق آج دنیا میں کہیں بھی ایک رول ماڈل ہیں۔ وہ انبیاء کی تعلیمات اور ان کے اخلاق کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔

لہٰذا اسلامی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی اخلاقی ترقی تمام حکام کے نفس کے گرد گھوم رہی ہے اور ان کی کوششوں سے ایسی خوشبو آتی ہے کہ آج دنیا میں ہر جگہ حسن اخلاق کا رنگ اور روغن ہے۔ وہ نفس قدسیہ کی کاوشوں کے لیے ان کے لیے دعا گو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب کے اختلافات کے باوجود اخلاقی احکام کے لحاظ سے ان سب میں ایک نسبتی اتحاد ہے اور یہ سب ایک ہی معدنیات کا نچوڑ اور ایک ہی سمندر کی موجیں ہیں۔

حاصل بحث

اسلامی نظریہ اخلاق انسان کو احساس ذمہ داری سے بھر پور کردیتا ہے ۔ وہ انسان کو ایک بلند ترین مقصد عطا کرتا ہے۔ جس سے اس کی زندگی کا صحیح رخ

[1]۔ البقرہ،۲: ۲۶۴

متعین ہوجاتا ہے اور اس کی حرکت اسی محور کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ وہ مقصد ہے رضائے الٰہی یہ مقصد انسان کو ایک مضبوط چٹان کی مانند کائنات کے حواد ث میں کھڑا کردیتا ہے۔ کوئی خوف، کوئی لالچ، کوئی ترغیب اسے بلند تر مقام سے گرا نہیں سکتی۔ ہر اچھی صفت کا اصل مقام اس کی زندگی میں خود بخود متعین ہوجاتا ہے اور اس بنیاد سے ارتقا کی منزلوں کو طے کرنا شروع کردیتا ہے اور برابر آگے ہین بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سارے رزائل اس کی زندگی سے خارج ہوجاتے ہیں اور وہ حقیقی طور پر رب کا نائب بنارہتاہے۔ یہ مقصد انسانی اعمال وافعال کو تمام اغراض ونفسیانی و مادی خواہشات سے بلند تر کردیتا ہے۔ اس مقصد کو اپنا کر انسان اپنے اصلی مقام کو پالیتا ہے اور غلط روی سے بچ جاتا ہے اور روز مرہ کی زندگی میں ایک شریف انسان بن جاتا ہے۔ دوسرے کے ساتھ اس کے تعلقات ایک پاکیزہ بنیاد پر قائم ہوجاتے ہیں۔ غرض اخلاق سے جو اصل غرض ہے وہ صرف اسلامی نظریہ اخلاق سے حاصل ہوتی ہے ورنہ انسان کے افراط وتفریط کمی بیشی میں مبتلا ہوجانے کا خدشہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔